Al-Qirtas ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

تانیثیت کے مبادیات کا فکری مطالعہ

Mazhar Riaz — M.Phil Scholar (Urdu), NCBA&E, Sub Campus, Multan
Saira Afzal — M.Phil scholar (urdu), NCBA&E, Sub Campus, Multan
Dr. Rafia Malik — Professor, Department of Urdu NCBA&E, Sub Campus, Multan

Abstract
Feminism formulates an intergenral concept of the feminist movement that promotes gender equality and opposes perpetuation of gender discrimination at social and culture front.The theme of this article revolves around the analysis of feminist movement with respect to the folk culture and traditions.
Keyword: Feminism

تانیثیت فیمینزم انیسویں صدی میں ابھرنے والی اہم سیاسی، سماجی اور ادبی تحریک ہے۔اس تحریک کا آغاز حقوق نسواں کی تحریک کے تحت اٹھنے والے مطالبات سے ہوا اور فیمینزم کی اصطلاح بعد میں آئی۔تاہم فیمنسٹ کے نظریات بہت پہلے موجود تھے۔انگریزی لغات کے مطابق فیمینزم کے معنی یہ ہیں۔

1-"The belife and aim that women should have the same rights and opportunities as men."(1)

2- "A doctrine advocating political economic and special equality of sexes:2: organized activity on behalf of women's rights and intoests."(2)

3-The policy, practice or advocay of political economic and social equality for wome."(3)

اردو میں فیمنزم کے متبادل تانیث کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔تانیثیت کا اسم کیفیت "تانیث" ہے لغت میں جس کا مطلب مؤنث ہونا مؤنث بنانا اور تذکیر کی ضد ہے۔"(4)

اصطلاح میں فیمینزم یا تانیث کے معنی وسیع تر ہیں۔یہ اصطلاح صرف نسائیت اور مردانگی کے فرق کو واضح نہیں کرتی بلکہ عورت کی بطور انسان شناخت کا مقابلہ کرتی ہے۔فیمینزم کا آغاز انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے شروع کے سالوں میں عورتوں کے حقوق کے مطالبے سے ہوتا ہے۔کیرولائن اور جینٹ ہالینڈ کے خیال میں تحریک کے بنیادی مطالبات یہ تھے۔

Al-Qirtas ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

" In the UK and The USA, by the late nineteenth and early twentieth centuries women were actively campaigning around education, political representation, working condition, health, sexuality motherhood and Logal rights."(5)

تمام تانیثی مکتب ہائے فکر عورت اور مرد کے سماجی مقام میں صنفی امتیاز کہ رویوں کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ان سب کا بنیادی مقصد عورت کی استحصال اور اس کے حقوق کی پامالی کی وجہ بننے والے عناصر کو روکنا ہے۔ مرد کی بالادستی انسانی تاریخ کی اولین ناانصافیوں میں سے ایک ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عورت نے اپنے حقوق کے لیے جدوجہد ہمیشہ جاری رکھی ہے اور وہ اپنی ذاتی زندگیوں میں حقوق کی جنگ لڑتی آتی ہے۔ مردوں کے پاس طاقت رہی ہے اور انہوں نے اپنی بالادستی کا ہمیشہ فائدہ اٹھایا ہے۔

سیمون دی بوا نے اس صورتحال کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

""انسانیت نر ہے اور مرد کو بالذات نہیں بلکہ اپنے ساتھ تعلق کے حوالے سے متعین کرتا ہے۔ اسے ایک خود مختیار وجود نہیں سمجھا جاتا۔"(6)

عورت کی کمتر معاشرتی حیثیت قدرتی نہیں بلکہ ثقافتی ہیں و گرنہ بحیثیت انسان مرد اور عورت برابر ہیں مرد و زن کا مساوی انسانی درجہ ان کے لیے مساوی حقوق کا متقاضی ہے۔اس لیے عورت کو نہ صرف قانونی سیاسی اور معاشرتی سطح پر برابر کے مواقع ملنا ضروری ہے بلکہ ان کی ذہانت اور تخلیقیت کا اعتراف بھی ضروری ہے جیسے آج تک صرف نظر ہی کیا گیا ہے۔

ورجینیا وولف کی کتاب "a roomfor once own" اچھا متبوہ1929ء اور سیمون دی بوا کی کتاب the second sex مطبوعہ1949ء نے عورتوں میں شوہر کی بیداری اور مرد انے غلبہ سے نجات کا احساس پیدا کرنا اہم کردار ادا کیا۔ سیمون بھی بوا کی کتاب کو تانیثی تنقید کی بائبل بھی قرار دیا جاتا ہے۔

کے۔اے کیمجن نے لکھا ہے کہ سیمون دی بوا نے عورت کو اس کے مقام سے آشنا کروایا

اس نے چند الفاظ

"One is not born, but rather becomes a woman."(7)

میں بہت بڑی سچائی کو پیش کر دیا۔

عورت پیدا نہیں ہوتی بنادی جاتی ہے۔ عورت اور مرد کی تقسیم فطری سے زیادہ ثقافتی ہے۔

اس کے بعد کیٹ میلٹ کی کتاب "مطبوعہ1969ء sexual politics" ایلن شووالٹر کی کتاب"A literature of their own" کے۔اے کیمجن نے تانیثی تحریک کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔اس کے نزدیک پہلی لہر جس کا مطالبہ برابری کا تھا۔ 1949ء میں سیمون دی بوا کی کتا پر ختم ہو جاتی ہے۔ "The second sex" دوسری لہر جس کا بنیادی مطالبہ مرد احساس معاشرے میں عورت کے اس استحصال کو چیلنج کرنا ہے۔ فرائیڈن کی کتاب سے ہوا جو تاحال جاری ہے۔ "The feminine mystique" کی تین اقسام بتائی ہیں۔Feminists جوڈیتھ ایم بارڈورک نے conservative feminist.1 ۔ جو کہ گھریلو ذمہ داریوں کی ان منصفانہ تقسیم اور کام کی مساوی اجرت کو کافی سمجھتے ہیں. 2 Mainstream feminist قانون میں تبدیلی لانا چاہتی ہیں یہ لوگ بنیادی طور پر تبدیلی کی خواہ ہیں اور نظام میں اپنی مرضی کے مطابق تبدیلی چاہتی ہیں۔

Redical feminists.3

ان کا خیال ہے کہ معاشرے کو بنیادی طور پر بدلنا ضروری ہے۔ صرف چند اس اصطلاحات کافی نہیں۔

Al-Qirtas
ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

عورت سے غیر مساوی سلوک:

"اکیسویں صدی میں بھی عورتوں کی حالت میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ عورتوں سے بازار اب بھی سجتے ہیں۔ عورتوں کو جلانے اور ان کے چہروں پر تیزاب پھینک کر چہرہ بگاڑ دینے کے واقعات برابر ہوتے رہتے ہیں۔ Honour killing آج کے زمانے میں بھی ویسی موجود ہے جیسی پرانے زمانے میں موجود تھی۔ اس سلسلے میں نہ تو ہمارے مذہبی رہنما کچھ کرتے ہیں اور نہ ہی ہمارے سیاستدان ایسے قانون بناتے ہیں کہ ان جرائم کی سختی سے روک تھام ہو سکے "(8)

پاکستانی عورتوں کی سماجی صورتحال کا جائزہ لیا جائے تو یہ تلخ حقیقت سامنے آتی ہے۔ پاکستانی عورت محکوم حیثیت میں زندگی گزارتی ہے۔ بچپن سے بڑھاپے تک معاشرے پر حاوی مرد اس کی زندگی کے تمام فیصلے کرتا ہے۔ تعلیم، شادی، نوکری، اولاد حتی کہ صحت کی سہولتوں تک کا انتخاب اس کے لیے مرد کرتا ہے۔ پاکستانی عورت ایک ایسی دنیا میں رہتی ہے جو اس کے لیے مردوں نے بنائی ہے۔

پاکستانی معاشرے میں لڑکیوں سے بچپن سے ہی امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ انہیں لڑکوں سے کم کھانا اور دیگر سہولتیں میسر ہوتی ہیں۔ تعلیم کا حق ہم لڑکیوں کو کبھی بھی مساوی نہیں ملتا۔ چھوٹی عمر میں ہی لڑکیوں پر گھریلو کام کاج کا بوجھ ڈال دیا جاتا ہے۔ آبادی کے بڑے حصے کے خراب معاشی حالات کے باعث لڑکیوں سے ناپسندیدگی عام ہے۔ اور انہیں بچپن ہی سے بوجھ ہونے کا احساس دلایا جاتا ہے۔ پیدائش سے عورت کی ثانوی حیثیت متعین کر دی جاتی ہے چونکہ عورت والدین اور خاندان کا معاشی سہارا نہیں بن سکتی۔ پاکستانی عورت ایک بڑے خاندان کی ذمہ داری اٹھاتی ہے۔ اسے گھر کی پوری ذمہ داری اٹھانی پڑتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کم از کم آٹھ یا دس بچے بھی پیدا کرتی ہے اور وہ جس حالت میں ہوتی ہے حمل یا بچے پیدا کرنے کی حالت میں اسے گھر کی پوری ذمہ داری نبھانی پڑتی ہے۔ اسے گھر کے کام کا پورا حساب دینا ہوتا ہے۔ دیہات میں کم عمری کی شادی کا رواج عام ہے اور وہ بھی بڑے عمر کے آدمی سے شادی کے بعد وہ فیملی پلاننگ سے آگاہ نہیں ہوتی اگر ان کو اس بارآگاہی ہوتی ہے تو شوہر اور سسرال کا خوف وہ فیملی پلاننگ نہیں کر سکتی۔ ہمارے معاشرے کی عورت چودہ گھنٹے گھر کے کام مویشیوں کے کام شوہر کے کام اور بچوں کو سنبھالنے میں لگاتی ہے اگر چوبیس میں سے آٹھ گھنٹے اس کے پاس رہ جائے تو وہ بھی ذہنی پریشانی اور دباؤ میں گزر جاتے ہیں۔ چودہ گھنٹے مسلسل کام کرنے کے بعد بھی ان کاموں کو کوئی کام نہیں سمجھا جاتا۔ عورت مرد کے برابر کھیتوں میں کام کرتی ہے۔ آج کے جدید دور میں بھی عورت مرد کے ساتھ کھیت میں گندم کی کٹائی گھاس کی کٹائی گنا کی کٹائی چاولوں کی کٹائی اور دیگر کاموں کی برابر شریک ہے حتیٰ کہ ٹیوب ویل اور پانی لگانے تک کی ذمہ داری عورت پر ڈالی جاتی ہے لیکن پھر بھی عورت کے کام کو کام نہیں سمجھا جاتا کیونکہ یہ ان کی روزانہ کی روٹین میں شامل ہوتے ہیں۔ ان کو ایسے کام کا کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا۔ ذاتی خواہشات سے مرحوم رکھا جاتا ہے ان کی تمام ضروریات پوری نہیں کی جاتی۔ بہت زیادہ کام کرنے کے باوجود بھی وہ کوئی اچھی معاشی حیثیت نہیں رکھتی۔ عورت چاہے مرد کے ساتھ مل کر جتنا کام کر لے گھر کو سنبھال لے پھر بھی سارا کریڈٹ مرد کے سر جاتا ہے۔ عورت کو صحت کی بنیادی سہولتیں حاصل نہیں نہ تعلیم کی اپنے گھر کے جانوروں کے دودھ ہوتے ہوئے لیکن فروخت کیا جاتا ہے لڑکوں کو مائیں پینے کے لیے دیتی ہیں لیکن لڑکیوں کو نہیں لڑکیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے انہوں نے کون سا ہمیں کما کر کھلانا ہے۔ پرائمری تعلیم عام کرنے کی سرکاری کوششوں کے نتیجے میں دیہات میں بچیوں کو سکول تو داخل کروا دیا جاتا ہے مگر فصلوں کی بوائی اور کٹائی کے موسم میں ان لڑکیوں کو سکول نہیں بھیجا جاتا۔ بلکہ ان سے کھیتوں میں کام لیا جاتا ہے۔

ہمارے معاشرے کی عورت معاشی جبر کے ساتھ ان گنت سماجی ناانصافیوں کا بھی شکار ہے۔ ہمارے معاشرے میں وٹہ سٹہ، ونی سوارہ، قران سے نکاح، غیرت کے نام پر قتل، دشمنی کے بدلے خواتین کی عزت کی پامالی، پولیس کی تحویل میں خواتین سے جسمانی زیادتی، خواتین پر تیزاب پھینکنے اور خواتین کو ہراساں کرنے کے واقعات عام ہیں۔ اگر کوئی لڑکا اپنی مرضی سے یا پسند کی شادی کرنا چاہتا ہے تو اس کے وٹے سٹے پہ بہن کو وٹہ بنا دیا جاتا ہے اس کی پسند ناپسند کا خیال نہیں رکھا جاتا بعد میں اس کا گھر بسے یا نہ بسے اس بات کو مد نظر نہیں رکھا جاتا۔ عورت پر سماجی رسوم کا بہت زیادہ دباؤ ہے۔ اس دباؤ کے زیر اثر ہر طبقے کی عورت متاثر ہوتی ہے۔ عورتیں بیرونی دباؤ کے ساتھ ساتھ گھریلو تشدد بھی برداشت کرتی ہیں۔

ڈاکٹر زاہد محمود گھریلو تشدد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

Al-Qirtas ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

"گھریلو تشدد اس طرزِ عمل کو کہتے ہیں جو مسلسل کسی شخص کے خلاف اس کے لیے روا رکھا جائے اس کی حرکات و سکنات اور قوت وارادی کو قابو میں لایا جاسکے۔ جسمانی اور جنسی تشدد اسی طرز کی مثالیں ہیں۔ گھریلو تشدد کے حربوں میں چیخنا چلانا، گالیاں دینا، دھکے دینا، مار پیٹ کرنا، تھپڑ مارنا، گلا گھونٹنا، کاٹنا کسی ہتھیار سے مارنا، ڈرانا دھمکانا اور ہراساں کرنا، جان لینے کی دھمکی دینا کسی کے جذبات اور احساسات کو مجروح کرنا کسی کے ماں باپ یا بزرگوں کے بے عزتی کرنا کسی کو نیچا دکھانا کسی کو سرعام بے عزت کرنا، کسی کو دوسروں کے سامنے ذلیل کرنا، جنسی تشدد، جبر کرانا، زور زبردستی سے کام لینا، جنسی حملہ اور زنا بالجبر کا ارتکاب شامل ہے۔"(9)

ڈاکٹر فوزیہ رانی اپنی کتاب (پاکستانی خواتین کے افسانوں میں نسوانی کردار) میں کہتی ہیں پاکستانی عورت کو جو قانونی حقوق حاصل ہیں موجودہ سماجی ڈھانچے میں ان کا حصول بھی عورت کے لیے ممکن نہیں۔ عورتیں اپنی شادی کے معاملے میں انتخاب کا حق نہیں رکھتی تمام سماجی طبقوں میں عورت کی شادی اس کی پسند سے ہونا معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ فوزیہ رانی کہتی ہیں چولہوں کا پھٹنا، عورتوں کا مختلف واقعات میں آگ لگنے سے ہلاک ہونا اور خودکشیاں (جو دراصل قتل ہوتی ہیں) اس سلسلے کے سسرالی تشدد کا نتیجہ ہیں۔ اسلام کی رو سے عورت کے لیے گھر اور نان ونفقہ کی فراہمی میں شوہر کا فرض ہے جسے بالعموم فراموش کر دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس مرد ایک سے زائد شادیوں کی اجازت کو ہر فرد پر اولیت دیتے ہیں جس کے بحث عورت کی سماجی حیثیت مزید خراب ہو جاتی ہے۔

رشیدہ پٹیل کے مطابق:

"اسلام کی بنیادی اور اصلی تعلیمات پر لوگ روایات یا اپنی برادری کے رواجوں کی تہہ چڑھا دی گئی ہے۔ مثلاً بیشتر مسلم ممالک میں زوجین کے مابین موجود باہمی حقوق کا وہ توازن جو اسلام نے قائم کیا ہے عورت کے نقصان میں مرد کی طرف ڈھلکا دیا گیا ہے۔ اکثر بیویوں کو ان کے حقوق احکام قرانی اور اس سلسلے میں اخلاقی اور اس سلسلے میں اخلاقی کی تعلیمات تک کو نظرانداز کرتے ہوئے طلاقیں دیتے رہتے ہیں۔"(10)

مرد اساس معاشروں کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہوتی ہے اور عورتوں کے لیے ہر کام میں حدود و قیود مقرر ہوتی ہیں۔ یہی حال پاکستانی معاشرے کا ہے۔ پاکستانی عورت کی صورتحال اور مسائل مشرقی ممالک بالخصوص ترقی پذیر اور پسماندہ خطوں کی عورت کے مسائل سے گہری مماثلت رکھتے ہیں۔

کشور ناہید کی شاعری میں تانیثیت اور ماحولیاتی تانیثیت کے عناصر بہت زیادہ ہیں۔ عورت کے استحصال کا تعلق کسی خاص معاشرہ کسی خاص قوم عہد یا کسی خاص مذہب سے نہیں بلکہ اس عالمگیر سوچ سے ہے جو مرد کی پیدائش کے ساتھ ہی وجود میں آجاتی ہے۔ البتہ اس سوچ نے مختلف قوموں اور معاشروں میں مختلف انداز میں اظہار پایا۔ ہندوستان کے معاشرے میں جہاں عورت کو ایک طرف دیوی کے استھان پر بٹھایا گیا تو دوسری طرف اسے اپنے شوہر کی چتا میں زندہ ستی ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ ہندوستانی معاشرے میں عورت کی تذلیل میں کوئی کسر نہ چھوڑ چھوڑی گئی یہ وہی معاشرہ تھا جہاں عورت اپنا نام ہونے کے باوجود تمام عمر گمنام ہی رہتی اور اسے اس کے باپ شوہر اور بعد ازاں بیٹے کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں طویل عرصہ تک ادب کے میدان میں بھی خواتین لکھاریوں کو اپنے نام سے اپنا الگ مقام اور شناخت بنانے کی اجازت نہ تھی۔ اسی ہندوستانی معاشرے میں شاعری کے میدان میں ادا جعفری، سارا شگفتہ، پروین شاکر، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور افسانوی ادب کے میدان میں قرۃ العین حیدر، رشید جہاں، عصمت چغتائی، رضیہ فصیح احمد، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، الطاف فاطمہ، فرخندہ لودھی زاہدہ حنا جیسی بلند آہنگ آوازوں نے جنم لیا۔ ان میں شعری اور افسانوی ادب کی ایک بلند آہنگ آواز کشور ناہید ہے وہ ایک نڈر بہادر خاتون تھی انہوں نے خاص طور پر خواتین کے استحصال کے خلاف شاعری کی اور افسانوی ادب ہر دور میں مزاحمتی رویہ اختیار کیا۔

ڈاکٹر سیما صغیر کے نزدیک:۔

"کشور ناہید کا انداز اور زاویہ نگاہ جداگانہ ہے۔ انہوں نے خواتین کے استحصال کو اپنا اپنا اہم موضوع بنایا ہے۔ مگر منفرد طریقے سے انہوں نے عورت پر مرد کی اجارہ داری حکومت کرنے کی خواہش کی نا صرف مزمت کی ہے بلکہ عورت

Al-Qirtas ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

کے سماجی شوہر کی نمائندگی کرتے ہوئے مشرقی عورت کے مسائل اور نفسی کیفیات کا بیان کیا ہے۔ وہ عورت کے ادھورے وجود سے خائف ہے اور "پوری عورت" کو دیکھنے کی خواہش مند ہیں۔"(11)

کشور ناہید نے نہ صرف شاعری میں بلکہ نثری تحریروں میں بھی فیمینزم کے حوالے سے آواز بلند کی ہے۔ ڈاکٹر عظمی فرحان فاروقی نے فیمنزم کے حوالے سے کشور ناہید کی کاوشوں کی نشاندہی ان الفاظ میں کی ہے۔

"کشور ناہید کی آواز شاعری کے ساتھ تنقیدی حوالے سے بھی فیمنزم کی بہت اہم اور نمایاں آواز ہے۔ شناسائیاں، بری عورت کتھا، بری عورت کے خطوط، عورت زباں خلق سے حال تک، عورت خواب اور خاک کے درمیان ۔۔۔۔۔۔ یہ سب کشور ناہید کی نثری کاوشیں ہیں ان کتابوں کے عنوانات سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کشور ناہید کے فکر و فن کا موضوع عورت ہے۔"(12)

ہندوستانی معاشرہ وہ معاشرہ ہے جہاں عورت کی سب سے بڑی خوبی اس کی بے زبانی کو قرار دیا جاتا ہے۔ اسے اپنے باپ اور بھائی سے لے کر شوہر اور بیٹوں کسی کے سامنے بھی لب کشائی کی اجازت نہیں بلکہ لب کشائی کو اس کا سب سے بڑا جرم قرار دیا جاتا ہے۔ ایسا جرم جس کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے۔ اسے زندہ رہنے کے لیے سانس بھی لینا ہے تو گھٹن زدہ ماحول میں اس کے لیے صرف گھر کی چار دیواری ہی نہیں بلکہ اپنی ذات بھی ایک قید خانہ ہے۔ قہقہے تو دور کی بات ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی اس کا جرم بن سکتی ہے۔ یہاں تک کہ اسے اپنے دکھوں پر رونے کی اجازت نہیں اس کی آواز کو منحوس کہہ کر دبا دیا جاتا ہے۔ گویا زندہ رہنا اس کا سب سے بڑا جرم تصور کیا جاتا ہے۔

نیلم احمد بشیر نے بھی خواتین کے حقوق کے لیے احتجاج کیا ان کے ہاں ظلم و ستم کو خاموشی سے برداشت کرتی عورت کا تصور محال ہے۔ وہ ہمت اور حوصلے کی تحریک دیتی ایسی شاعرہ اور ادیبہ ہیں جو زندگی کے روشن پہلوؤں کی بھرپور مزاحمت کرتی ہیں۔

نیلم احمد بشیر چھوٹے چھوٹے سماجی واقعات سے لے کر بین الاقوامی سطح تک کے معاملات کے مختلف پہلوؤں کو مہارت سے الفاظ کا روپ عطا کرتی ہیں انہیں ڈرانے اور سہا دینے والے الفاظ متاثر نہیں کرتے وہ بے باک اور نڈر خاتون ہیں وہ مظلوم طبقے کی آواز ہے جس کا وصف معاشرتی حقائق کا بیان ہے۔ وہ کہتی ہیں پاکستانی معاشرے کے مرد نے ذہنی طور پر عورت کی انفرادی حیثیت کو قبول نہیں کیا وہ یہ تو چاہتا ہے کہ اس کی بیوی تعلیم یافتہ مگر وہ زبان سے گونگی ہو حق پر بات نہ کرے مرد برداشت نہیں کرتا عورت اس کے سامنے حق بات کہے۔ نیلم کے افسانے "لالا کی بیٹی" (مشمولہ جگنو کے قافلے) کی شمی بھی اس مسئلے کا شکار ہے ڈاکٹر ہونے کے باوجود اسے نوکری کرنے کی اجازت نہیں چونکہ اس کا مالدار شوہر اکرم یہ پسند نہیں کرتا کہ شمی اپنی ذات کے لیے کوئی قدم اٹھائے چونکہ اس کے بچے اس کے آڑے آجاتے ہیں اور ماں باپ بھی صبر کی نصیحت کرتے ہیں۔ شمی کا کردار ایک طرف عورت کی مجبوری کو سامنے لاتا ہے جو جدید عہد کے آزاد معاشرہ کا فرد ہوتے ہوئے بھی اپنی صلاحیت کے اظہار کا حق نہیں رکھتی دوسری طرف مردانہ اقدار اور سوچ کے ناقابل تبدیل عناصر کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے جو صرف گھر کو بنائے اور گھر بنائے رکھنے کی ذمہ داری صرف عورت پر عہد کرتے ہیں۔

شمی کے الفاظ:

"میں صرف اس کے کچن اور بستر کے قابل ہوں اور کسی قابل نہیں میں کسی قسم کا کوئی فیصلہ کبھی نہیں کر سکتی۔ اپنی مرضی سے کہیں آجا نہیں سکتی اپنے ساتھی ڈاکٹروں سے نہیں مل سکتی صرف اس لیے کہ میں عورت ہوں یعنی کم تر ہوں ایک مکمل باشعور انسان نہیں ہوں۔"(13)

نیلم حمد بشیر کہتی ہیں جاگیر دارانہ نظام میں عورت کے استحصال کی کئی صورتیں ان کی شادی نہ کرنے، حق بخشوائی اور قرآن سے شادی وغیرہ کی صورت میں سامنے آتی ہیں۔ پاکستانی عورتیں اکیسویں صدی میں بھی اس قسم کی رسم کی بھینٹ چڑھ رہی ہیں۔ نیلم کے افسانے "لے سانس بھی آہستہ" نور بانو کی شادی قرآن سے کر دی جاتی ہے۔ وہ تو اپنی حق تلفی کو ہی ڈھال بناتی ہے۔ اسے شادی کے روز ہی پتہ چلتا ہے کہ اس کی شادی قرآن سے ہو رہی ہے تو وہ ہزیانی انداز میں "ان اللہ مع الصابرین" بار بار پڑھتی ہے۔ ان حالات میں وہ اجنبی مرد کے ساتھ تعلق بناتی ہے اور پھر اسے حمل ہو جاتا ہے۔ اور پوچھنے پر بتاتی ہے کہ وہ شادی شدہ ہے اور یہ بچہ مقدس کتاب کا بچہ ہے وہ ایک عجیب قیامت کھڑی کر دیتی ہے۔ یہ

Al-Qirtas
ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

ایک انتہائی رد عمل ہے جو روایتوں میں جکڑی عورت کی بغاوت کی وارننگ ہے۔ یہ عورت اپنے عہد کی عورتوں کے بڑے طبقے کی نمائندہ ہے اور روایتوں پر قربان ہونے کے باوجود عورت کی انسانی حقوق کا مطالبہ کرتی ہے۔

1960ء کے بعد شاعری کی شروعات کرنے والی پاکستانی شاعرات میں ایک اہم نام فہمیدہ ریاض کا ہے انہوں نے طائف الملوکی کے دور میں ہوش سنبھالا وہ چھپ چھپ کر اشتراکی ادب کا مطالعہ کرتی تھیں۔ انہوں نے کمیونسٹ پارٹی بھی جوائن کی تھی۔ اشتراکیت کے سبب وہ فیض احمد فیض کی شاعری سے بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ فہمیدہ ریاض نے محسوس کیا کہ سندھیوں کو ہر طرح سے نظرانداز کیا جارہا ہے اور عورت کے حقوق پر کوئی توجہ نہیں کہیں درگور اور کہیں قرآن سے شادی۔ انہوں نے احتجاج کیا۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "بدن دریدہ" جب شائع ہوا تو ایک کہرام مچ گیا انہوں نے ہر نقطہ پر اشارہ کیا جہاں انسانیت پامال ہو رہی تھی عورتوں کے حقوق پامال ہو رہے تھے انہوں نے جنسیات کے متعلق بہت کچھ لکھا۔ ترجمہ کے میدان میں بھی انہوں نے اہم کارنامہ سرانجام دیتے ہوئے شیخ ایاز کے سندھی کلام کو اردو میں نہایت بلیغ ترجمہ کیا۔ فہمیدہ ریاض کی زیادہ تر نظمیں نو مر لڑکیوں کے خوابوں اور ان کے تصورات کے عکاسی کرتی ہیں۔ عورت مرد کے ازلی رشتے میں جسم و جان کی قیمت پر بھی عورت کی جانب سے وفا کی ریت نبھانے کی کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔

نظم "جھجک"

یہ میری سوچ کی انجان کنواری لڑکی
غیر کے سامنے کچھ کہنے سے شرماتی ہیں
اپنی مبہم سی عبارت کے دوپٹے میں چھپی
سر جھکائے نظریں کترا کے چلی جاتی ہے۔
(پتھر کے میدان)

فہمیدہ ریاض ایک بے باک نڈر فنکار ہیں۔ جن کے موضوعات کو دوسری شاعرات شجر ممنوعہ سمجھ کر کبھی چھونے کی جرات نہ کر سکی ان کی شاعری کو جنسی لذت پرستی کا الزام دے کر نظرانداز کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور سیاسی مہم جوئی کی شاعری کا الزام بھی لگا۔ جس سماج میں فہمیدہ ریاض رہی ہے وہ سماج جبر و استعداد سے بھرا ہوا تھا انہوں نے موضوعات کو چھوا تو انہوں نے مرد کی جبلی تعلقات کی فطری ضرورت کی نظموں میں برتا بھی ہے زیادہ تر مرد عورت کی ظاہری شکل و صورت سے متاثر ہو جاتا ہے۔ مگر وہ عورت کے جذبات احساسات اور خیالات کے بارے میں نہیں سوچتا۔

"سورۃ یسین" (نظم)

شاید میں رستہ بھول گئی
یہ راہ تو میری راہ نہیں
اس راہ سے میں کب گزری تھی
سب گلیوں پہ یہاں نام لکھے
اس گلی پہ کوئی نام نہیں
(بدن دریدہ)

جاگیر دارانہ نظام کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے جہاں شرم و حیا کے نام پر عورت کا صدیوں سے استحصال ہو رہا ہے۔ نظم جہاں طنزیہ عنصر پیش ہوا ہے وہیں معنویت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ فہمیدہ ریاض اپنی شاعری میں ایک عورت کے جذبات کو انتہائی بے باکی سے بیان کرتی ہے۔ عورت زندگی میں بیٹی، بہن اور بیوی کے تجربات سے گزرتی ہے انہوں نے خواتین کے مسائل پر کھل کر بات کی اس لیے وہ باغی بھی کہلائی۔ فہمیدہ ریاض کی شاعری احتجاج کی شاعری ہے۔ ان کے ہاں ہجرت کا درد بھرا ہوا ہے۔ کیونکہ ان کی شناخت تانیثی مسائل سے ہوتی ہے ان کی شاعری ایسا آئینہ ہے جو عورتوں کے مسائل پر مبنی ہے۔

Al-Qirtas
ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

حوالہ جات

1. Oxford advanced learners dictionary up current English, shally wehmeier, sixth edition oxford University press 2000 P .489
2. The new Britanica - webster dictionary & reference Guide Encyclopedia Britannica Inc USA,1981, P-330.
3. The new lexicon webster dictionary of the English language, Encyclopedia edition, lexicon publication New York ,1989, P-346
4. اردو لغت (تاریخی اصول پر) ترقی اردو بورڈ کراچی، جلد چہارم 1982ء ص 908
5. Ramzanoglu Caroline with Holland Janet, Feminist Methodology challenges and choice,Sag publication, London ,UK 2007, P-5
6. سیمون دی بوا، عورت (مترجم) یاسر جواد، فکشن ہاؤس لاہور، 1999ء، ص 18
7. K.A Kanjakkan, feminist and Indian Realities P-99
8. عطیہ خان، تاثرات ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، 2007ء ص 115
9. زاہد محمود، ڈاکٹر، گھریلو تشدد۔ وجوہات، اثرات اور انسداد، نگارشات لاہور، 2006ء ص 25، 26
10. رشیدہ پٹیل، پاکستانی عورت کی سماجی و قانونی حیثیت، کل پاکستان انجمن خواتین (ابوا) کراچی، 1981ء ص 26
11. ڈاکٹر سیما صغیر، تانیثیت اور اردو ادب روایت مسائل اور امکانات، ص 34
12. ڈاکٹر عظمی فرمان فاروقی، اردو ادب میں نسائی تنقید، روایت مسائل و مباحث، کراچی، سعید پبلیکشنز 2010ء ص 98
13. نیلم احمد بشیر، جگنوؤں کے قافلے، سنگ میل پبلی کیشینز لاہور، 1993ء ص 153

Al-Qirtas ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

ادب حیاتِ انسانی کا ترجمان ہے۔ ادب کے تاریخی ارتقا کو بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ موجود سے غیر مطمئن اور غیر موجود کا دلدادہ رہا ہے۔ اس کا رُخ بے چینی، بے قراری کی جانب رہا ہے۔ ادب کی بنیاد تخیل پر ہے اس بنا پر تحرک اور تبدیلی اسے پسند آتی رہی ہے۔ ادب کے مزاج کی اس بے چینی کا رنگ بعض اوقات بغاوت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

مزاحمت عربی زبان کے لفظ ''زخمہ'' سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی حریف سے ٹکرانے یا مدافعت کے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں مزاحمت سے مراد ایسا طرزِ عمل ہے جو کسی ناموافق صورتِ حال کو اپنانے سے انکار اور ناآسودگی کا اظہار ہے۔ اردو ادب میں مزاحمت سے مراد یہ ہے کہ اگر ادیب یا شاعر اپنے عہد کی موجودہ صورتِ حال سے غیر مطمئن ہو، وہ استحصال کے خلاف آواز اُٹھائے تو ایسا ادب مزاحمتی ادب کے زُمرے میں آئے گا۔ اس حوالے سے اگر تاریخِ ادبِ اردو کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہند میں شاعری کی ابتدا ہی مزاحمت سے ہوئی اور جعفر زٹلی اوّلین مزاحمتی شاعر کے طور پر منظرِ عام پر آئے۔

اگر انسانی تہذیب و تمدن کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مزاحمت کی روایت حیاتِ انسانی کے جتنی ہی قدیم ہے۔ ظلم اور اس کے خلاف مزاحمت اور احتجاج کا سلسلہ تو حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ تب سے لے کر عصرِ حاضر تک یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔

عالمی ادب کی تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی انسان پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے گئے، دنیا کے انسان دوست اور روشن ضمیر اُدبا اور شعرا نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ خواہ وہ رومین رولاں ہوں آندرے مالرو ہو یا گارشیا لورکا، ساکر ہو یا ناظم حکمت، اقبال ہوں یا فیض، غرض ہر دور اور ہر ملک کی تاریخِ ادب میں مزاحمتی فکر کی متعدد امثال موجود ہیں۔

مزاحمتی ادب ہر اُس ملک اور معاشرے میں پیدا ہوتا ہے جہاں سماج ظالم اور مظلوم میں تقسیم ہوتا ہے۔ جہاں سامراج کا تسلط ہوتا ہے جہاں طبقاتی نظام کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔ جہاں ذات پات کی تفریق ہوتی ہے جہاں عوام بنیادی ضروریاتِ زندگی اور عزت و وقار سے محروم ہوتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں معاشرے کے باشعور شعرا اور اُدبا حالات کو تبدیل کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے وہ معاشرے میں پیدا ہونے والے ظلم اور ناانصافیوں کو محسوس بھی کرتے ہیں۔ اور اس کے خلاف آواز بھی بلند کرتے ہیں۔ مزاحمت کرنے والوں کو اگرچہ کٹھن راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے وہ نہ صرف روحانی اور جسمانی کرب سے دوچار ہوتے ہیں بلکہ انھیں اپنی جان و مال کو بعض حالات میں قربان کرنا پڑتا ہے۔

مزاحمت کے متعلق روبینہ سہگل ''عورت اور مزاحمت'' میں رقم طراز ہیں:

> ''مزاحمت ہر ایسے عمل، سوچ، رویے یا طریق کار کو کہا جا سکتا ہے جو کسی ناانصافی، ظلم، تشدد و بربریت یا جبر کے خلاف کیا گیا ہو۔ مزاحمت سے مراد ہے کسی چیز کو روکنا، کسی ظلم کی مخالفت کرنا، کسی ناانصافی کو برداشت کرنے سے انکار کرنا''۔[i]

عموماً شعرا سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ حق و انصاف کے علمبردار رہیں۔ علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

> ''پاک رکھ اپنی زبان تلمیذِ رحمانی ہے تو''

لیکن ہر دور میں فن کاروں کا ایک ایسا گروہ موجود ہوتا ہے جو اہلِ اقتدار کے غلط فیصلوں پر سراپا احتجاج ہوتا ہے۔ مزاحمتی عناصر ایسے شخصیات ہوتے ہیں جو ایک مخصوص فکری یا سیاسی ادارے کے خلاف اظہارِ رائے رکھتے ہیں اور اپنا احتجاج بآوازِ بلند کرتے ہیں ان کی مزاحمت شاعری، تحریکوں یا فلسفیانہ مؤقف کے ذریعے بھی ظاہر ہو سکتی ہے۔ علامہ محمد اقبال ایک ایسے مفکر ہیں جن کے فلسفیانہ افکار کی دنیا معترف ہے ان کے اشعار، انتقادی تصورات اور مفکرانہ مفاہیم نے پاکستانی معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

۱۸۵۷ کی شکست کے بعد اہلِ ہند کا ایک طبقہ انگریزوں کے تسلط کو دائمی سمجھ کر مغربی تہذیب کی پیروی کرنے لگا۔ ہندوستان میں دو گروہ پیدا ہو چکے تھے ایک گروہ وہ تھا جو مغرب کی سائنسی ترقی اور انگریزوں کی انتظامی اہلیت سے خاصا مرعوب تھا۔ ان کے اس طرزِ عمل کو طنز و ظرافت کے پیرایے میں اکبر الٰہ آبادی نے اُجاگر کیا جبکہ دوسرا گروہ مشرقیت کا دلدادہ اور مغربی تہذیب و ثقافت سے متنفر تھا۔ ۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی میں ہزیمت کے بعد دل شکستہ قوم میں روحِ تازہ پھونکنے کے ساتھ ساتھ انھیں زندگی کی جانب دعوتِ عمل دینے والوں میں حالیؔ اور ان کے ہمعصر رفقا نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کی ترقی یافتہ صورت اقبال کی شاعری میں دِکھائی دیتی ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں ایک نئی روایت سے آشنا کیا اور سماجی سطح پر ایک تبدیلی کا احساس پیدا کیا۔ اقبال اپنے کلام میں ایشیائی اور افریقی ممالک پر یورپ کی نوآبادیاتی طاقتوں کے تسلط کے حوالے سے فرنگ کو

Al-Qirtas ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

تنبیہ کرتے ہیں۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکان نہیں
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہو گا [ii]

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال کا یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے کہ اس دور میں جب نوآبادیاتی اور استعمار پیشہ مغرب، ایشیائی اور افریقی ممالک کی رگِ جاں کو اپنے دانتوں سے کاٹ کر ان کا لہو چُوس رہا تھا۔ اقبال نے پنجاب میں بیٹھ کر غلامی کے خلاف اعلانِ جہاد کیا.... اقبال جانتے تھے کہ جو سلوک برّصغیر کے ساتھ ہو رہا ہے وہی کچھ انڈونیشیا سے مراکش تک کی سرزمین کے ساتھ برتا جا رہا ہے۔ چناں چہ وہ پوری محکوم دنیا کا ضمیر بن کر اُٹھے اور غلامی کے خلاف شدید نفرت کا اظہار کیا''۔[iii]

ابتدا میں اقبال نے ''نیا شوالہ'' جیسی نظم لکھ کر فرقہ پرستی کی مذمت کی۔ بعد ازاں اقبال نے اُمّتِ مسلمہ کے فکری و عملی جمود کو توڑنے کی کوشش کی۔

ساقی شیر مردوں سے ہوا بیشہ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و مُلّا کے غلام اے ساقی [iv]

علاوہ ازیں اقبال نے اپنی اس نظم میں فرقہ پرستی کی بھی مذمّت کی۔

اقبال اپنے دور میں پائے جانے والے جمود اور مغربی تقلید کی روش سے متفق نہیں تھے وہ اجتہاد کے قائل اور خودی کو پروان چڑھانے پر زور دیتے ہیں۔ افکارِ اقبال سے مترشّح ہوتا ہے کہ اقبال کا خیال تھا کہ مسلمانوں نے اپنی علمی اور فکری روایت کو ترک کر دیا ہے اور مغرب کی اندھی تقلید کے قائل ہو گئے۔ اس تقلید کی وجہ سے مسلمان اپنی شناخت کھو رہے ہیں ان میں خود اعتمادی کی کمی روز بروز زیادہ ہو رہی ہے۔ اقبال اپنی شاعری میں مزاحمت کا اظہار درج ذیل الفاظ کی صورت میں کرتے ہیں:

نہیں ہے فلسفہ حیات ملیں تقلید و اجتہاد
بنائے نئے زمانے نئے شب و روز تازہ کار

اقبال نے معاشی اور سیاسی جبر کے خلاف مزاحمت بھی کی ان کی نظم ''لینن خدا کے حضور میں'' مزاحمت پر مبنی ایک نظم ہے۔ کہتے ہیں:

تو قادرِ مطلق ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

اقبال نے مغربی تہذیب کا عمیق نظری سے جائزہ لیا۔ اقبال کی شاعری میں مغرب کے خلاف غصہ اور احتجاج موجود ہے اس کی ایک وجہ تو اہلِ ہند کی غلامی تھی۔ دوسرے اقبال نے یہ بھی دیکھا کہ تمام عالمِ اسلام فرنگ کے غلبہ میں تھا۔ اقبال اس صورتِ حال پر مسلمانوں کو تسلی بھی دیتے ہیں۔ لیکن:

''ان تسلیوں کے باوجود اقبال کا دل غلبۂ فرنگ سے مجروح تھا۔ وہ اس کی تہذیب کی کیا داد دیتا جس کی بدولت مسلمانوں کی رہی سہی آزادی اور ملت کی خودداری غارت ہو رہی تھی''۔[v]

اقبال نے اپنی شاعری میں برطانوی راج کی سختیوں اور استعماریت کے منفی اثرات کو اجاگر کیا۔ اقبال نے اپنے اشعار میں مغربی تہذیب کی مادیت پرستی اور زوال کی بھی پیشین گوئی کی۔ اقبال نے مسلمانوں کے لیے مغربی تہذیب کو ایک خطرہ قرار دیتے ہوئے اس سے بچنے کی تلقین کی۔ علاوہ ازیں اقبال مسلمانوں کو اپنی اسلامی ثقافت اور اقدار کو زندہ رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں مزاحمت کا اظہار ان اشعار کی صورت میں ملتا ہے:

فرنگ دورِ حاضر میں ہے فرعون نو ظہور

Al-Qirtas
ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

۱۹۱۷ میں روس میں اشتراکی انقلاب برپا ہوا۔ اقبال اس نظام کی مادیت والحاد کو پسند نہیں کرتے تھے مگر چوں کہ سرمایہ داروں کی مخالفت اور غریبوں کی حمایت کرتے تھے اقبال معاشرتی انصاف سے وابستگی کے مظہر تھے۔ کبوتر، ممولا، کنجشک دراصل عقاب، شاہین، شہباز جیسے قوی پرندوں کے مقابلے میں کمزوری کا استعارہ ہیں اقبال بالِ جبریل میں کہتے ہیں:

اُٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے
گرماؤ غریبوں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو vi

اقبال سرمایہ داری کے بھی مخالف تھے۔ آپ اپنے کلام میں اس نظام کے رُو بہ زوال ہونے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اقبال اپنے کلام میں سرمایہ پرستی کے دور کے خاتمے کا اعلان کرتا ہے۔ فرماتے ہیں:

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا vii

پروفیسر الِ احمد سرور اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"..... اب وہ سرمایہ پرستی کے سفینے کے ڈوبنے کی التجا کرتے ہیں۔ وہ سلطانیِ جمہور کی خاطر نقشِ کہن کو مٹانے کے لیے بھی تیار ہیں۔ اس کھیت کو جلانے کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں جس سے دہقان کو روزی میسّر نہ ہو"۔ viii

اقبال تعلیم اور فن تعلیم پر بھی بھرپور توجہ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایسی تعلیم جو فرد میں یقین، خود اعتمادی، علم کی جستجو کا ولولہ، خودی کی تعمیر پیدا کرے وہ بہتر ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان میں ہندو قومیت کے جارحانہ عزائم، فرقہ وارانہ کش مکش اور فسادات کی صورت میں عیاں ہونے لگے شاعر یہ تمام مناظر دیکھ کر تڑپ اُٹھا۔ اقبال بے چین تھے کہ ان کے وطن میں قتل وغارت ہو رہی ہے۔ عداوت کی اس زہر آلود فضا میں حساس شاعر گھٹن کا شکار ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی ایک نظم "صدائے درد" میں کرب واضطراب کی کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے:

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے ix

اقبال مسلمانوں کے منتشر ہونے اور کمزور پڑ جانے کا غم محسوس کرتے ہیں۔ وہ اُمّتِ مسلمہ کی شیرازہ بندی اور اسلامیانِ عالم میں اتحاد، اتفاق، محبت کا خواب دیکھتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کو اپنے اختلافات فراموش کر کے ایک ہی مضبوط اُمّت ہو جانا چاہیے۔ فرماتے ہیں:

چلے تو کٹ ہی جائے گی یہ ظلمت کی رات
ذرا ہم تو آزمائیں گے اپنے بازو کی طاقت

اقبال نوجوانوں میں بھی خودی اور عمل کا ولولہ بیدار کرنا چاہتے تھے وہ مسلمان نوجوانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتے ہیں:

آزادیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

ترقّی پسند تحریک نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ بین الاقوامی سطح پر نو آبادیات کی آزادی، دوسری جنگ عظیم کی تیاریوں، کمیونسٹ انقلاب اور قومی سطح پر تحریکِ آزادی کے عروج کا دور تھا۔ لہٰذا ادب میں مزاحمتی عنصر کا اضافہ بھی ہوا۔ لیکن مارکسیت کے زیرِ اثر پنپنے والی یہ تحریک چونکہ ادب کے افادی پہلو کی قائل تھی لہٰذا پورے ترقی پسند ادب کو مزاحمتی ادب کا زرخیز سرمایہ کہا جا سکتا ہے۔ فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، جوش ملیح آبادی، جانثار اختر، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، مخدوم محی الدین، مجروح

Al-Qirtas ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

سلطان پوری وغیرہ نے سامراجیت، فاشزم، جاگیر دارانہ نظام، فرسودہ روایات، فرقہ پرستی وغیرہ کی مخالفت کو اپنی شاعری کا خصوصی موضوع بنایا۔ اقبال قوم کی جاوداں حیات کے لیے انقلاب کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں:

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

اقبال اپنے دور کے موجودہ نظام سے مطمئن نہیں اس لیے وہ ایسے جہان کی خواہش کرتے ہیں جو استحصال و جبر کو جنم نہ دے جہاں عدم مساوات اور معاشی ناہمواری نہ ہو۔ اقبال جبر و ظلم کے خاتمے کے تمنّائی ہیں۔ اقبال ایسے انقلابی سماج کے تمنائی ہیں جس میں ایک مزدور، کسان، غریب بھی خوش حال ہو۔ اقبال بندۂ مزدور کو انقلاب کا پیغام دیتے ہوئے کہتے ہیں:

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے [x]

ڈاکٹر اے بی اشرف لکھتے ہیں:

"....وہ ایک ایسا انقلابی معاشرہ تشکیل دینا چاہتے ہیں جس میں انسان تسخیرِ فطرت کرے۔ مادی مسائل کو بلا امتیاز سوسائٹی کے تصرف میں لائے۔ اس کے راستے میں استحصالی قوتیں حائل نہ ہو سکیں۔ وہ ایک ایسی سوسائٹی کو قائم دیکھنا چاہتے تھے جو احترامِ آدمیت کی بنیادوں پر اُستوار ہو۔ جہاں انسان انسان کی تذلیل نہ کر سکے۔ جہاں آدم قاتل آدم نہ بن سکے"۔ [xi]

اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے اپنے معاشرے کی مکمل عکاسی کی جب انگریزوں نے اپنی پالیسی کے تحت ہندوستانی قوم میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی تو اقبال ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار بن کر آئے۔ کلامِ اقبال میں ہندو مسلم اتحاد پر بہت سے اشعار ملتے ہیں۔ اقبال نے اپنے عہد کے مسلمانوں کے سماجی و سیاسی حالات کو اپنی شاعری میں من و عن پیش کیا۔ مسلمانوں کو ان کی عظمت کا احساس دِلانے کے لیے اسلامی تاریخ کا سہارا لیا اور اس کے ذریعے ان کے وقار کو بلند کرنے کی سعی کی۔ حکومتِ وقت اور سرمایہ داروں کے ذریعے غریبوں، کسانوں، مزدوروں پر کیے جانے والے مظام کے خلاف انھوں نے انقلابی شاعری کی اس طرح وہ شاعرِ انقلاب کے طور پر سامنے آئے۔

اقبال کو دُکھ ہے کہ اہلِ ہند کے لوگ اپنے انجام سے بے خبر، مذہب و ملت کی آویزشوں، مذہبی تعصب، فرقہ آرائی اور من و تو کے جھگڑوں میں مبتلا ہیں جب کہ اغیار ملک کا استحصال کر رہے ہیں ان امراض کا علاج ظاہری اختلافات کو ختم کرنے، محبت کو پروان چڑھانے اور دل میں وحدت کی شمع روشن کرنے میں مضمر ہے۔ اقبال عام ذہنی رجحانات اور رویوں کے خلاف احتجاجاً تلخ نوائی سے بھی کام لیتے ہیں وہ اقبال جس شدت سے اپنے دل میں درد محسوس کر رہے تھے اہلِ وطن کو اس سے آگاہ کرنا بھی ضروری تھا کیونکہ ان کا درد اجتماعی تھا۔ اقبال اہلِ وطن کو تنبیہ کرتے ہیں:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں [xii]

اقبال کا روئے سخن اقوامِ مشرق کی جانب ہے وہ اُمتِ مسلمہ کی مسلسل نشوونما چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک یورپ اپنی ہی تلوار سے گھائل ہو چکا ہے۔ اس تہذیب نے اپنے خنجر سے ہی خودکشی کر لی ہے۔ اقبال نے جہاں مغربی تہذیب کو بے نقاب کیا۔

اقبال نے اپنی شاعری میں مسلمانوں کو جدید دنیا میں اپنی پہچان برقرار رکھنے اور اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کی ترغیب دی۔ اقبال کے فکری اثرات پاکستان کی مزاحمتی شاعری پر بھی ہوئے۔ پاکستان میں مزاحمتی شاعری کے کئی معروف شاعر اقبال سے متاثر ہوئے ان میں فیض، حبیب جالب اور احمد فراز کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ اقبال کی شاعری آزادی، خودانحصاری اور خودشناسی کے موضوعات کو اُجاگر کرتی ہے۔ اقبال کی شاعری نے پاکستان کی سیاسی و سماجی رہنمائی میں اہم کردار ادا کیا ان کے فلسفیانہ خیالات سے سیاسی اور سماجی رہنماؤں کو نئے نظریات اور رہنمائی ملی جس سے ملکی ترقی اور استحکام میں مدد مل سکتی ہے۔ اقبال کی شاعری نے پاکستانی سماج کو بہت متاثر کیا افراد میں روحانی اور فکری تجدید کا عمل تیز کیا۔ ان کی تعلیمات نے حیاتِ انسانی کے ارفع مقصد اور خالق کے ساتھ تعلق کو گہرا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

Al-Qirtas
ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

پاکستانی اردو شاعری بھی پاکستان میں رقم ہونے والی تاریخ کی عکاس رہی ہے جب کبھی زندگی کو قید اور معطل کر دینے والی قوتیں اپنا گھیرا تنگ کرتی ہیں تو ان قوتوں کے خلاف مزاحمت فطری ردِّ عمل ظاہر ہوتا ہے جب تک کوئی فرد اور معاشرہ ظلم و جبر کے خلاف احتجاج بلند کرتا رہتا ہے زندہ اور پایندہ رہتا ہے کیونکہ حرف مزاحمت زندگی کی حرارت ہے جو ادب ظلم و بربریت کے خلاف اپنے ردِّ عمل کا اظہار نہیں کرتا کسی صورت زندہ ادب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر ہم پاکستان کے شعری ادب کے منظر نامے پر نظر دوڑائیں تو یہاں بھی شعرا کی تخلیقات میں مزاحمتی عناصر کا رنگ وافر مقدار میں موجود ہے مثلاً جدید دور میں سامراجی اور نو آبادیاتی نظام کے خلاف ایشیا، افریقا اور لاطینی امریکا کے ممالک میں اس دور کے مزاحمتی ادب میں الجزائر، فلسطین کے حریت پسندوں کی ۱۹۴۹ میں ترقّی پسند مصنفین کی کانفرنس ۵۲، ۱۹۵۱ میں سیفٹی ایکٹ کیس، ۱۹۵۸ میں جنرل ایوب کا مارشل لا، ۱۹۶۴ کے انتخابات، ۱۹۶۹ میں یحییٰ خان کا مارشل لا، بھٹو حکومت، جنرل ضیاء الحق کا مارشل لا، بے نظیر بھٹو کی بیس ماہ کی حکومت، جنرل مشرف کا مارشل لا، بے نظیر کا قتل، کشمیر اور افغانستان کا جہاد اور سیاسی و سماجی عدم استحکام ایسے بڑے واقعات ہیں جن کی بدولت مزاحمتی رویوں کو فروغ ہوا۔ چونکہ پاکستان کی تاریخ کا ایک طویل عرصہ مارشل لا کے تحت گزرا اس لیے طویل ترین تجربے نے مزاحمت کی لہر کو شاعری کا باقاعدہ حصہ بنا دیا۔ اس دور کی تخلیقات میں ایک طرف تلخی، کڑواہٹ، ملال، تذبذب، تشکیک اور مایوسی کی کیفیات موجود ہیں تو دوسری جانب اچھے دنوں کی آس اور روشن صبح کے خواب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ متعدد شعرا ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ۱۹۸۲ میں ظہیر کاشمیری کو جرأتِ اظہار کی سزا سنائی گئی۔ فہمیدہ ریاض کو اس قدر تنگ کیا گیا کہ وہ ہندوستان جانے پر مجبور ہو گئی۔ اس کے علاوہ فیض، ن م راشد، مجید امجد، احمد فراز، شورش کاشمیری، احمد ندیم قاسمی، جوش ملیح آبادی، اختر الایمان، جانثار اختر، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، اسرار الحق مجاز، سہیل اعظمی، ظہیر کاشمیری، عارف عبد المتین، فارغ بخاری، حبیب جالب، انیس ناگی، اداجعفری، کشور ناہید، پروین شاکر، زہرا نگاہ، عذرا عباس، شبنم شکیل، شاہدہ حسن، سارہ شگفتہ اور یاسمین حمید وغیرہ وغیرہ کی شاعری میں مزاحمت کا رنگ بہت گہرا ہے۔ ان شعرا نے شعوری طور پر پاکستان کے نامساعد سیاسی، سماجی صورتِ حال کے خلاف مزاحمت کی۔ فیض کی شاعری مزاحمتی ادب کی عمدہ مثال ہے وہ انسان کو بیدار کرنے، اسے ظلم و جبر کا احساس دِلانے کے قائل ہیں۔ فیض منفی رجحانات کے خلاف پُر امن احتجاج کرتے ہیں وہ خاموش عوام کو بولنے کا مشورہ دیتے ہیں:

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے [xiii]

یہ ایک ایسے انقلاب کی جانب پیش قدمی کے خواہش مند تھے جو غیر طبقاتی معاشرے کو وجود میں لاتا۔ فیض کی نظمیں، حذر کرو مرے تن سے، لوح و قلم، درد آئے گا دبے پاؤں، جشن کا دن، خوشا ضمانت غم، لہو کا سراغ، شورش بربط پا، متعین آوازیں، مزاحمتی نوعیت کی نظمیں ہیں۔ فیض کی شاعری کا اہم ترین پیرایہ مزاحمتی شاعری ہے جو انھیں معاصر ترقی پسند شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔

ن م راشد کی بیش تر نظمیں نو آبادیاتی استحصال کا شکار عوام کی ترجمان ہیں۔ ان کی نظمیں ''انسان، شاعر، درماندہ، سیاہی، دریچے کے قریب، شرابی، طلسم ازل، دستِ ستم گر، من و سلویٰ، آنکھیں، کالے غم، کی نظمیں آمریت کے خلاف مزاحمت کے بیان پر مشتمل ہیں۔ جوش ملیح آبادی کی شاعری میں مزاحمتی رویہ پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے مجید امجد کی تنہائیوں اور خاموشیوں کی حامل شاعری عام انسان اور عام انسان کے مسائل کے گرد گردش کرتی ہے۔ طبقاتی تقسیم انھیں تکلیف میں مبتلا رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں معاشرتی جبر، عدم توازن اور عام زندگی میں پیش آنے والے واقعات کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کی شاعری کا انسان اقدار کی شکست و ریخت اور زندگی کی ارزانی کے دور میں زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ صدر ایوب کی آمرانہ اور مارشل لا حکومت کے خلاف احتجاج کی ایک مؤثر اور گرج دار آواز حبیب جالب کی ہے انھوں نے ۱۹۶۲ کے حالات کے خلاف اپنی شہرہ آفاق نظم ''دستور'' لکھی ان کی نظموں میں سیاسی شور و غل اور نعرے بازی کے اثرات واضح دکھائی دیتے ہیں۔ معاشرتی برائیوں کے خلاف مزاحمت کا رویّہ جالب کی سیاسی سرگرمیوں کا نتیجہ تھا انھوں نے ۱۹۶۴ کے انتخابات میں صدر ایوب خان کے خلاف فاطمہ جناح کا ساتھ دیا اور مادرِ ملت کی انتخابی مہم میں جالب عوامی شاعر کے طور پر نمایاں ہوئے ان کی پُر جوش نظمیں مادرِ ملت کے جلسوں کو نئی حرارت دیتی رہیں۔ حبیب جالب کی نظمیں ''ماں'' اور ''مادرِ ملت'' اسی انتخابی مہم کا حصہ تھیں۔ ان کی نظمیں ''بیس گھرانے''، ''ریفرنڈم''، ''ایک نہتی لڑکی''، جنرل ضیا کے مارشل لا کے دور پر مشتمل سیاسی نوعیت کی نظمیں ہیں۔ نظم ''نیلو'' اور ''پابہ زنجیرِ رقص'' جبر و استبداد کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ انھیں بھی حکومتِ وقت کے خلاف بولنے پر قید و بند کی صعوبتیں سہنی پڑیں۔ حساس شاعر کے نزدیک پاکستان کو معاشرتی عدل و انصاف، آزادیِ تحریک، روشن مستقبل اور دل کش روایات کا امین ہونا تھا لیکن افسوس ایسا نہ ہو سکا۔

Al-Qirtas ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

احمد فراز ادبی دنیا میں رومانی شاعر کے طور پر متعارف ہوئے لیکن ان کی ابتدائی شاعری کے علاوہ باقی شاعری ایک گھٹن زدہ معاشرے کی نمایندگی کرتی ہے۔ معصوم شاعر کو یقین ہے کہ ظلم کا خاتمہ ہوگا اور حق کی فتح ہوگی۔ فراز کی شاعری کی بے حرمتی، استحصال، انسانیت اور جمہوریت کی پایمالی کے خلاف سراپا احتجاج ہے۔ جبر واستبدادی قوتوں کے خلاف انھوں نے عزم وہمت، حوصلے اور ولولے، قوم اور قومیت کی سالمیت کے لیے جوش وجذبے کو پیش کیا۔ انھوں نے عوام اور قوم کے جذبات اور آواز کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ انھوں نے اپنی پُرعزم شاعری کے ذریعے لوگوں میں جبر استحصال کی مخالفت کی۔ حمید اختر لکھتے ہیں:

''بعض لوگوں کی موجودگی ہی، اس امر کی ضامن ہوتی ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے ظلم، جبر اور ہر قسم کی ناانصافی کے خلاف مزاحمت جاری رہے گی۔ فراز بھی ایک ایسا ہی انسان تھا''۔ [xiv]

مزاحمت فراز کی طبیعت کا خاصّہ تھا۔ ان کی شاعری میں مزاحمتی اور باغیانہ رنگ قدرے نئے انداز میں نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ایک حساس، آزاد منش، جمہوریت پسند شخص، آزادیِ اظہار، آزادیِ رائے، استحصال، ابستدادی قوتوں، پُرآشوب عہد، محرومی، بے کسی، آمریت، جمہوریت، انسانی مسائل، انقلابی رویوں اور مزاحمت کے عناصر پر خصوصی توجہ دی۔ انھوں نے حیاتِ انسانی کے مسائل شخصی صداقتوں، کا ادراک بلاخوف سیاسی رمزیت سے بیان کیا ہے۔ فراز جانب دارانہ فیصلوں اور اعمال کے خلاف سراپا احتجاج ہوتے ہیں۔

''حبیب جالب کے بعد پاکستان میں اگر کسی شاعر نے اپنے کلام میں واشگاف انداز میں جمہوریت، آزادیِ فکر اور عوام کے حقوق کے استحصال کو بیان کیا ہے تو وہ یقیناً احمد فراز ہیں''۔ [xv]

فراز کی ''قاتل''، ''اے بھوکی مخلوق''، ''خیر مقدم''، ''اے میرے وطن کے خوش نواؤ''، ''یہ کھیت ہمارے ہیں یہ کھلیان ہمارے'' مزاحمت پر مشتمل نظمیں ہیں۔

ظہور نظر کی شاعری میں بھی پاکستان کے مختلف سیاسی ادوار کے ارتعاشات دِکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری مارشل لا ادوار کی جبریت کے خلاف صدائے احتجاج ہیں۔ انھوں نے ایوب خان، بھٹو، اور ضیاء الحق کے مارشل لا کے دور میں اپنے اجتماعی ردِّ عمل کا دل نشین انداز میں اظہار کیا۔ یہ تمام عمر مصلحتوں سے گریزاں رہے اور حق وصداقت کا پرچار کرتے رہے۔ ان کی کتاب ''بے چہرہ سوال'' اور نظم ''تم سے پہلے'' مزاحمتی ادب کا مؤثر حوالہ ہے۔ کہتے ہیں۔

سیدھی راہوں کس نے منزل پائی ہے
گمراہی سے گام ملا کر چلنے دو
کوئی تو اس دور کا بھی سقراط بنے
یارو ہمیں یہ زہر اب نگلنے دو

شورش کاشمیری، نصراللہ خان عزیز، نصیر احمد ناصر، نعیم صدیقی، محسن بھوپالی، حمایت علی شاعر کی شاعری معاشرے کے مظلوم طبقات کی آواز ہونے کے ساتھ ساتھ مزاحمتی فکری کی عکاس بھی ہے۔ افتخار عارف نے اگرچہ سانحۂ کربلا اور خانوادۂ رسول ﷺ سے منسلک کردار وواقعات کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔ انھوں نے اہلِ سیاست، اہلِ دین کی بے ضمیری، خلقِ خدا کی شورش، غرض عصری حالات وواقعات کو مزاحمتی انداز میں پیش کیا۔ افتخار عارف ملک میں آمریت اور گھٹن زدہ ماحول میں احتجاج کر کے کھلی فضا کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

کوئی تو پھول کھلائے دُعا کے لہجے میں
عجیب طرح کی گھٹن ہے ہوا کے لہجے میں [xvi]

افتخار عارف نے مزاحمت کا اظہار مختلف علامتوں اور استعارات کے پردوں میں کیا۔ ان کی نظموں ''آخری آدمی کا رجز''، ''قصہ ایک نسبت کا''، ''ایک رُخ''، ''خوف کے موسم میں لکھی گئی ایک نظم''، ''خون بہا''، ''احتجاج''، ''التجا''، ''جھوٹ''، ''اعلان نامہ''، ''استغاثہ'' میں مزاحمتی انداز واضح نظر آتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد حکومتیں عوامی توقعات پر پورا نہیں اتریں، آمریت کا طویل دور انیہ چلا، مارشل لا کا دور بھی آیا۔ خواتین شعرا نے بھی ان حالات وواقعات پر کھل کر اظہار کیا۔ زہرہ نگاہ کی شاعری میں مزاحمت اور انقلاب کے نغمے سبک اور شیریں لے میں نظر آتے ہیں اگرچہ وہ ملکی عالمی اور ملی حالات سے دل برداشتہ ہوئیں وہ مسلمانوں کی کس

Al-Qirtas ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

مپرسی پر خون کے آنسو بہاتی ہیں لیکن پھر بھی امید کا دامن نہیں چھوڑتیں۔ انھیں امید ہے کہ ایک دن ظلم و جبر کے بادل چھٹ جائیں گے۔ ادا جعفری کہتی ہیں:

تیرگی میں کبھی اور کبھی دُھوپ میں
زندگانی کے ماتھے کا ٹیکا صدا جگمگاتا رہا
سچ کہو دوستو ، سچ کہو ساتھیو [xvii]

کشور ناہید نے پدری نظامِ معاشرت کے پیدا کردہ جبر کے خلاف شعری مزاحمت کی۔ ان کی مزاحمتی آواز سچائیوں کی عکاس ہے۔ فہمیدہ ریاض نے بھی پدری ذہنیت کو ہدفِ ملامت بنایا۔ اس نوع کی نظموں میں ''چادر اور چار دیواری''، ''باکرہ''، ''راج سنگھاسن''، ''پتھر کی زبان''، ''گڑیا''، ''حاشیہ''، ''آدمی کی زندگی'' شامل ہیں۔ علاوہ ازیں پروین شاکر، زہرہ نگاہ، عذرا عباس، نسیم سید، عشرت آفرین، شبنم شکیل، سارہ شگفتہ، یاسمین حمید نے بھی پدری جبر، عائلی زندگی کی بے بضاعتی، گھٹن، منافقانہ فعل، ریاستی جبر، آمریت غرض نامساعد حالات کے متعلق واشگاف الفاظ میں مزاحمت کی۔

پاکستانی شعرا کی شاعری میں ایسے اشعار کی خاصی مقدار موجود ہے جن میں مزاحمت اور احتجاج کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ مزاحمت کی اصل وجہ ناآسودگی ہے۔ خواہ یہ ناآسودگی انفرادی ہو یا اجتماعی، معاشی ہو یا سماجی، گویا ناآسودگی کا اظہار مزاحمت کی پہلی سیڑھی ہے یعنی ان شعرا کی شاعری میں سماجی، معاشی معاملات کی جانب ناآسودگی کا رجحان دِکھائی دیتا ہے۔ یہ شعرا ان سماجی قدروں کو ختم کرنا چاہتے تھے جو استحصالی نظام کی شناخت تھی۔ اس کے لیے کہیں انھوں نے واضح اور کہیں علامتی انداز اختیار کیا۔ ان کی شاعری میں تاریکی، سیاہی، رات، ظلم و استحصال کی علامتیں تھیں اس کے برعکس سحر، صبحِ درخشاں، سورج، روشنی، نویدِ انقلاب، نئی زندگی کی علامتیں تھیں۔

اقبال اور ان کے مابعد شعرا نے سماجی حقائق سے قارئین کو متعارف کروایا انھیں بہتر اور خوب تر مادی زندگی کی جھلک دِکھائی۔ اگرچہ ان شعرا نے رومان کی حسین وادیوں میں بھی سفر کیا اور زندگی کے نشیب و فراز سے متعارف کرواتے ہوئے زندگی کے تلخ حقائق کی جانب بھی توجہ مبذول کی۔ ان شعرا نے اقبال کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے زندگی میں ناانصافی، استحصال اور سماجی عدم توازن کے خلاف اپنے مشاہدات و تجربات کو شاعری کی صورت میں ڈھال کر گویا خاموش لبوں کو قوتِ گویائی عطا کی۔ مظلوم عوام میں اپنے حقوق کا شعور پیدا کیا اور انسانیت کو محبت کا مرکز و محور قرار دیا۔ انھوں نے دنیا کے ہر مظلوم کے لیے آواز بلند کی چاہے وہ فلسطین کے محکوم عوام ہوں یا ایران کے یا پھر افریقا کے مظلوم عوام ہوں یا شام کے یا افغانستان کے ہوں، ان کی ہمدردیاں سب کے لیے یکساں تھیں۔ ہماری دانش وری کی وہ روایت جو سر سیّد اور اقبال سے ہوتی ہوئی ہمارے دور تک پہنچی اور جس نے مغرب کو سمجھنے کے بعد ایک نئی مشرقیت ایک نئے قومی تشخص کے آثار مرتب کیے۔

یہ شعرا اپنے کلام میں غربت اور زندگی کے تلخ حقائق بیان کرتے ہیں اور پیغام دیتے ہیں کہ خواہ حالات کتنے ہی مشکل کیوں نہ ہوں، ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ یہ ظلم و ستم کے خاتمے پر یقین رکھتے ہیں۔ انھوں نے یاس کے بجائے آس، ناامیدی کے بجائے امید اور قنوطیت کے بجائے رجائیت کا علم بلند کیا۔ ان کا کلام ٹوٹے ہوئے دلوں کی امید بندھاتا ہے اور پریشان حال عوام کو نوید سناتا ہے۔ اگرچہ ان میں اسے اکثر شعرا نے ذاتی طور پر قید و بند کی صعوبتوں کو برداشت کیا۔ زمانے کے آلام و صدمات کا شکار رہے لیکن اس کے باوجود مایوسی کے آگے ہتھیار نہیں ڈالا یہ پختہ عزم و یقین کے ساتھ اہلِ وطن کی ہمت بڑھا کر ایک روشن مستقبل کی جانب اشارہ کرتے رہے۔

اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے قومیت کے جدید تصورات کی تشکیل کی انھوں نے مسلمانوں کے روحانی و فکری امراض کی نشاندہی کر کے ان کا حل بھی دریافت کیا۔ غلامی کی ذلت، آزادی کی قدر، اتحاد کی اہمیت، فرقہ واریت کی زیاں کاریاں، جہد و عمل، رجائیت کے ثمرات اور سامراج کی سازشیں غرض ہر رنگ کلامِ اقبال میں موجود ہے۔ شمیم حنفی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''مغرب اقبال کے لیے ایک سامراجی طاقت کے بجائے دراصل ایک تہذیبی اقتدار اور استحصال کی علامت تھا۔ مشرقی اقوام میں مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی ترقی پر مبنی تہذیب سے مرعوبیت بلکہ خوف زدگی کا جو رجحان پنپ رہا تھا اپنی نظم و نثر کے ذریعے اقبال نے پورے مشرق کو اس سے بچانے کی کوشش کی۔ اقبال کے یہاں اسی لیے آزادی کا جو تصور ملتا ہے اس کی اساس دراصل تہذیبی، اخلاقی اور روحانی ہے''۔ [xviii]

اقبال اور محولہ بالا شعرا کی شاعری محض ایک فردِ واحد کی سوچ کے طور پر ظاہر نہیں ہوتی بلکہ اپنی ذات کو باقی دنیا کے عوام کے ساتھ باہم متصل کر کے نہ صرف سماج کی آواز بنتے ہیں بل کہ ان کی شاعری اجتماعیت کے کامل احساس کی عکاس بھی ہے۔ اقبال کے مانند ان کا مقصد عوام کے دلوں میں انقلاب پیدا کرنا، ان کے جذبوں کو صیقل کرنا اور

Al-Qirtas ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

عقل کو فہم و فراست عطا کرنا تھا۔ان کی شاعری کی عظمت کا راز اس امر میں پوشیدہ ہے کہ اپنی تمام تر نظریاتی و فلسفیانہ وابستگی کے باوجود شعریت کے اخراج سے خود کو بچا لیا۔ انھوں نے شعوری طور پر اپنی شاعری کے ذریعے پاکستان کے نامساعد سماجی، سیاسی اور معاشی صورتِ حال کے خلاف احتجاج کیا۔مزاحمت کی آواز بلند کی، بغاوتیں اور نویدِ صبح کی بشارتیں بھی دیں۔

مزاحمتی ادب ایک بامقصد ادب ہے جس کا مقصد انصاف و مساوات پر مبنی ایک اچھے معاشرے کا قیام ہے۔مزاحمت کے عمل میں سب سے کٹھن مرحلہ وہ ہوتا ہے جب ریاستی جبر واستبداد عروج پر ہو۔پاکستان میں ہر آمر نے اپنے دورِ حکومت میں ہر اس آواز کو قوت کے زور پر کچلنے کی کوشش کی جو اس کے خلاف بلند کی گئی۔ان نامساعد حالات میں جن افراد کے پایۂ استقلال میں لغزش نہیں آتی وہی لوگ مزاحمت کے راستے سے گزرتے ہوئے انقلاب برپا کرتے ہیں۔

علامہ محمد اقبال کی ادبی میراث میں مزاحمتی عناصر کا اہم کردار رہا ہے اقبال ایک انسانیت پرست، قومی محب اور فکری جدوجہد کے قائل تھے لیکن ان کی تحریروں میں بھی مزاحمت کے مخصوص موضوعات ملتے ہیں کہیں وہ اکبر کی تقلید کرتے ہوئے مزاحمت کو مزاحیہ انداز میں اشعار کی صورت بیان کرتے ہیں:

میاں نجّار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

اقبال نے معاشرتی حقائق، سیاسی اور دینی موضوعات پر بھی مزاحمت کی ہے۔جب بھی سامراجیت، ظلم و جبر اور استحصال نے پنجے گاڑے تو محکوم اقوام کے شعرا نے درست معنوں میں دیدۂ بینائے قوم ہونے کا ثبوت دیا۔

اقبال کی شاعری نے ہمارے شعور پر گہرے اثرات مرتب کیے۔اقبال کی شاعری نے قومیت کے احساس کو بیدار کیا۔ان کی شاعری وطن سے محبت، اسلامی اصولوں سے محبت اور پاکستان کی تعظیم کا جذبہ موجود ہے۔اقبال کی شاعری میں انقلاب اور خود آگاہی کا جذبہ موجود ہے۔آپ کے اشعار عدل، انصاف اور امن کے پیام بر ہیں۔اقبال کے اشعار ہمارے شعور کو جلا بخشتے اور دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں۔اقبال کے کلام، خطبات، مکاتیب غرض شعری اور نثری تصانیف فارسی اور اردو تحاریر نے متعدد انداز سے پاکستانی شعرا کو متاثر کیا اور پاکستانی سماج کو قومیت، علم و فن، انقلاب، رومانیت، معاشرتی ترقی، تعلیمی اصلاح اور فلسفیانہ اصولوں کی اہمیت کو اُجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔علاوہ ازیں فکرِ اقبال نے پاکستانی سماج میں انقلاب برپا کرنے، قومیت کے فروغ، معاشرتی ترقی، تعلیمی اصلاح، انسانی حقوق اور بہتر زندگی گزارنے میں مثبت کردار ادا کیا۔اقبال کی شاعری میں مزاحمتی شاعری کا اثر نا گزیر ہے۔ان کی شاعری میں مزاحمتی عناصر کی مختلف صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔اقبال کی شاعری میں مزاحمتی عناصر کا تحریکی، فکری اور انقلابی انداز موجود ہے جو ان کی شاعری کو ایک مضبوط پہلو عطا کرتا ہے۔جو پاکستانی عوام کو خوابِ غفلت سے بیدار کر سکتا ہے۔اقبال کی مزاحمتی شاعری کی جھلکیاں پاکستانی شعرا کی شاعری میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں جو ہمیں اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے اور بہتر مستقبل کی جانب بڑھنے کی راہ دکھاتی ہے۔کلامِ اقبال میں مزاحمتی عناصر کا بیان انداز اور ان کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے غور و فکر پر مجبور کرتا ہے۔کلامِ اقبال میں مزاحمتی عناصر کی موجودگی پاکستانی سماج کو ایک بہترین مستقبل کی جانب لے جاتی ہے اور قارئین کو یہ مترشّح ہوتا ہے کہ ہمیں اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے، اس کی حفاظت کرنے اور امن اور عدل کی بنیادوں پر مبنی معاشرتی نظام کی تشکیل کے لیے مزاحمت کرنا ہوگی۔

کلامِ اقبال میں مزاحمتی عناصر نے پاکستان کے فکری اور ادبی ورثے کو نیا جہان، ایک نیا مفہوم دینے میں مدد فراہم کی ہے۔کلامِ اقبال میں مزاحمتی عناصر اور پاکستانی معاشرے پر اس کا اطلاق مختلف پہلوؤں کو سمجھنے اور متفرق مسائل کو حل کرنے میں مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔حکیم الامت اور ہمارے شعرا نے آزادی اور جمہوریت کی جدوجہد میں ہمیشہ اپنی آواز بلند رکھی اور یہ جدوجہد ہمارے شعرا نے صرف پاکستان کی تحریکِ آزادی کے حوالے سے ہی نہیں بلکہ فلسطین، کشمیر، افریقا، عراق، بوسینیا، ویت نام، الجزائر اور افغانستان کی تحاریکِ آزادی کے ساتھ بھی خیر سگالی کے جذبات کا اظہار مختلف صورتوں میں کیا۔تراجم کے ذریعے سے جہاں چی گویرا، ناظم حکمت، بینجمن مولائس، محمود درویش سے متعارف ہوئے وہیں جدید تراکیب، علامتی نظام، اسالیب اور لفظیات کے حوالے سے اردو ادب کو ثروت مند بنایا۔گزشتہ پچھتر برس سے شعر و ادب کا سرمایہ نشاندہی کرتا ہے کہ ہمارے شعرا نے اپنے عہد کے ضمیر کی حفاظت کی اور اپنے تجربات و مشاہدات کو دوسروں کے لیے بامعنی بنانے کی ذمہ داری احسن طریقے سے نبھائی۔عصرِ حاضر کے شعرا یہ سمجھتے ہیں کہ سرسیّد تحریک کے افادی منشور سے لے کر ترقی پسند تحریک کی شعریات تک بیرونی احکامات کا جو سلسلہ چلتا آرہا ہے اسے اب ختم ہونا چاہیے کیونکہ اب مسئلہ انسان کی ذہنی اور تخلیقی آزادی کا ہے۔

Al-Qirtas
ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

حواشی:

i روبینہ سہگل، ''عورت اور مزاحمت''، مشعل، لاہور، ۱۹۹۴، ص ۲۳۔

ii علامہ اقبال، ''کلیاتِ اقبال''، عثمان پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۰، ص ۱۹۶۔

iii اسلم ملک، ''تعلیماتِ اقبال''، علامہ اقبال فاؤنڈیشن سیال کوٹ، ۱۹۸۶، صفحہ ۹۳۔

iv علامہ اقبال، ''کلیاتِ اقبال''، عثمان پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۰، ص ۲۵۔

v خلیفہ عبدالحکیم، ''فکرِ اقبال''، بزمِ اقبال لاہور، ۲۲۹، ۱۹۸۸۔

vi علامہ اقبال، ''کلیاتِ اقبال''، عثمان پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۰، صفحہ ۲۸۴۔

vii ایضاً، ص ۲۸۵۔

viii آلِ احمد سرور، ''اقبال اور اُن کا فلسفہ''، مکتبۂ عالیہ لاہور، ۲۰۰۹، ۱۳۶۔

ix علامہ اقبال، ''کلیاتِ اقبال''، عثمان پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۰، صفحہ ۴۲۔

x ایضاً، ص ۳۷۶۔

xi ڈاکٹر اے بی اشرف، ''شاعروں اور افسانہ نگاروں کا مطالعہ''، سنگ میل پبلشرز لاہور، ۲۰۰۹، صفحہ ۱۱۱۔

xii علامہ اقبال، ''کلیاتِ اقبال''، عثمان پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۰، صفحہ ۸۷۔

xiii فیض احمد فیض، ''نسخہ ہائے وفا''، مکتبۂ کارواں لاہور، ۱۹۸۴، ص ۱۲۷۔

xiv حمید اختر، ''زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے''، مشمولہ ماہِ نو، احمد فراز نمبر، جلد ۶۲، شمارہ جنوری ۲۰۰۹، ص ۱۵۔

xv انور زاہدی، ''کر گئے کوچ کہاں کو چۂ جاناں والے''، مشمولہ کتاب بیادِ احمد فراز، اکتوبر ۲۰۰۸ تا ۲۰۰۹، ص ۵۰۔

xvi افتخار عارف، ''مہر دو نیم''، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۱۳، ص ۱۲۲۔

xvii ادا جعفری، ''سازِ سخن بہانہ ہے''، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، ۱۹۸۸، ص ۵۷۔

xviii شمیم حنفی، ''اقبال اور عصر حاضر کا خرابہ''، اکادمی بازیافت، ص ۵۹۔